سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور ۷۶

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ

(دوسرا ایڈیشن)

از قلم

سرکار سید العلماء علامہ الحاج سید علی نقی النقوی مدظلہ العالی
مجتہد العصر

قیمت ۲؍ آنے

امامیہ مشن پاکستان

کے سلسلۂ اشاعت کا ۷۶ واں شاہکار "شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ"
محرم ۱۳۷۹ھ پر پہلی بار شائع کیا گیا تھا جسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ
اس کا پہلا ایڈیشن چند ماہ کے قلیل عرصہ میں ختم ہوگیا۔ اب دوبارہ شائع کرنے کی سعادت
حاصل کی جارہی ہے۔

یہ کتابچہ سرکار سید العلماء علامہ الحاج سید علی نقی النقوی صاحب قبلہ مجتہد العصر لکھنؤ
کی اس معرکۃ الآرا تقریر پر مشتمل ہے جو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے دسویں محرم کی
رات کو براڈکاسٹ ہوئی تھی۔

سرکار سید العلماء مدظلہ نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ الرحمۃ کی مشہور
رباعی کے ایک مصرع "شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ" کی اپنے مخصوص انداز
میں فاضلانہ توضیح فرمائی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ افراد ملت اس رسالہ
کی بھی کثیر سے کثیر تعداد خرید فرما کر یوم عاشور عوام الناس میں تقسیم
کرکے رضائے الٰہی کا شرف حاصل کریں گے۔

امامیہ مشن پاکستان کے حسینی فنڈ میں عطیہ بھیجنے کی صورت میں آپ
کو مرسلہ عطیہ سے دوگنی قیمت کا لٹریچر ارسال خدمت کیا جائے گا۔

جنرل سیکرٹری

امامیہ مشن پاکستان اردو بازار لاہور ۲

جنوری ۱۹۶۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؏

بے شک حسینؑ شاہ تھے، اگر وہ دنیوی بادشاہ نہ تھے، نہ اس بادشاہت کے کبھی طالب ہوئے نہ انھوں نے اس بادشاہت کے لیے جنگ کی۔ "دنیوی بادشاہ" وہ ہوتا ہے جو تاج و تخت رکھتا ہو، جو حشم و خدم کا مالک ہو جس کے گرد لاؤ لشکر جمع رہتا ہو، مگر حسینؑ تو اس نانا کے نواسے تھے جو دو دو وقت بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے پھرا کرتا تھا جس کے گھر سے کئی کئی دن دھواں نہ اٹھتا تھا، اس ماں کے بیٹے تھے جو اپنے گھر میں چکی پیستی تھی اور جھاڑو دیتی تھی۔ اس باپ کے بیٹے تھے جو باغوں میں جا کر مزدوری کرتا تھا اور محنت و مشقت سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔

ان کے نانا رسول اللہؐ کا قدرتی جاہ و جلال گو اتنا تھا کہ سلاطینِ روم و فارس کے درباروں کو دیکھنے والے کہتے تھے کہ وہاں وہ رعب و داب نہیں جو یہاں نظر آتا ہے۔ مگر انھوں نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا پسند نہ کیا۔ ان کے سامنے جب ایک عرب آیا اور ہیبت سے تھرّانے لگا تو انھوں نے کہا، سنبھل جا۔ سنبھل جا۔ میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں تو عرب کی

ایک غریب عورت کا فرزند ہوں جو بہت معمولی غذا کھاتی تھی۔

ان کی مقدس ماں فاطمہ زہراؑ جو پیغمبر اسلامؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ گو اتنی سخی اور فیاض تھیں کہ گھر پر سے کسی سائل کو محروم واپس نہیں کیا، مگر اپنے مقدس باپ کی فقیرانہ سیرت کی ایسی پیرو تھیں کہ دروازہ پر ایک بوسیدہ پردہ کے سوا کبھی دوسرا پردہ نظر نہ آیا۔ عرصہ تک تو گھر کے کاروبار کے لیے کوئی کنیز یا خادمہ تھی ہی نہیں جب ایک کنیز جس کا نام فضّہ تھا پیغمبرؐ نے گھر کے کام کاج کے لیے عطا کی تو یہ ہدایت کردی کہ ایک دن گھر کا کام تم کرنا، ایک دن فضّہ سے لینا۔ حضرت فاطمہؑ نے ہمیشہ اسی پر عمل رکھا۔

حسینؑ کے بلند مرتبہ باپ حضرت علی مرتضیٰؑ، اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار، سب سے بڑے فاتح، پیغمبرؐ کے وزیر اور مسلمانوں کے سردار تھے جنھیں رسولؐ نے خود امیر المومنینؑ کا خطاب دیا تھا اور جنھیں آج تک بچہ بچہ جناب امیرؑ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ مگر اس امارت کے باوجود غربت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ایسی کہ بھوسی ملا ہوا جَو کا آٹا غذا میں کھاتے تھے۔ اور پیوند دار لباس پہنتے تھے ایسے نانا کی گود میں پل کر ایسی ماں کی پرورش اٹھا کر اور ایسے باپ کی تعلیمات حاصل کر کے اپنی خداساز بلند فطرت کے ساتھ ساتھ حسینؑ کا مزاج بھی فقیرانہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ گو سخاوت، جلالت، وجاہت اور شان ان میں موروثی تھی مگر شاہانہ غرور و تمکنت، شاہانہ جاہ و حشمت، شاہانہ

طنطنہ وطمطراق اور سب سے زیادہ شاہانہ فریب سیاست سے انکو دلی نفرت تھی اور اسی بنا پر وہ بادشاہ تھے نہ اپنے کو بادشاہ سمجھتے تھے نہ دوسروں کی زبان سے بادشاہ کہے جانے کو پسند کرتے تھے۔

وہ اس بادشاہت کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔ اس وقت جب حضرت امام حسنؑ نے معاویہ سے مصالحت کرکے تخت سلطنت ان کے سپرد کر دیا تو بہت سے آدمی اچھے ممتاز درجہ کے لوگ حضرت امام حسینؑ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کھڑے ہو جیئے ہم آپ کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کے دل میں سلطنت کی کوئی خواہش ہوتی تو یہ بہت اچھا موقع تھا مگر آپ نے انکار کیا۔ پھر اس وقت جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوگئی تو لوگ پھر حضرت امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا کہ اب کھڑے ہو جائیے۔ حضرتؑ نے پھر بھی انکار کیا۔ اور برابر خاموشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ دنیا دی سلطنت کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔

آپ نے اس بادشاہت کے لیے جنگ بھی نہیں کی۔ جب آپ اس کے طالب ہی نہیں تھے تو اس کے لیے جنگ کیا کرتے۔ اس کے علاوہ یہ آپ کے قول و عمل دونوں سے ظاہر ہے۔

اگر آپ بادشاہت کے لیے جنگ کرنا چاہتے تو اسی وقت جب آپ کو سابق امیر شام کی وفات اور یزید کے تخت سلطنت

پر بیٹھنے کی اطلاع ہوئی اور مدینہ کے حاکم نے آپ کو بیعت کے لیے طلب کیا تھا، اسی وقت حاکم مدینہ پر حملہ کر دیتے مدینہ پر قبضہ کر لیتے اور پھر اپنی قوت میں اضافہ کرکے یزید سے برسر پیکار ہوتے جبکہ عبداللہ بن زبیر کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ حجاز و عراق ہی میں اپنی سلطنت قائم کرکے ایک کافی مدت تک حکومت شام سے لڑتے رہیں تو حسینؑ کے لیے ایسا کیوں نہیں ممکن تھا۔ حالانکہ آپ مسلمانوں کے دلوں پر عبداللہ بن زبیر سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے۔

اس کے بعد جب مکہ میں آپ پہنچے، تاریخ بتلاتی ہے کہ اس وقت لوگوں نے عبداللہ ابن زبیر کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا اور حضرت امام حسینؑ کے گرد رہنے لگے۔ مگر آپ نے کسی اقتدار کے حصول کے لیے اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس وقت جب کہ کوفہ کے لوگوں نے مذہبی ہدایت کی غرض سے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تو انھوں نے یہ لکھا کہ اگر آپ آئے تو ہم حکومت شام کے گورنر کو نکال دیں اور تخت سلطنت پر قبضہ کرلیں مگر آپ نے انکو لکھا کہ امام کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو نافذ کرے فرائض و ہدایت کو انجام دے اور تعلیمات خداوندی سے ایک سر مو انحراف نہ کرے۔ انکا مطلب یہ تھا کہ مجھے دار الحکومت یا تخت سلطنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھے تو ہدایت خلق

منظور ہے۔ احکامِ خدا کی تبلیغ مدِ نظر ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ جناب مسلم بن عقیل جو حضرت کے نمائندہ ہو کر کوفہ گئے تو انھوں نے خاموشی کے ساتھ ایک دوست کے مکان پر قیام کر لیا اور کوشش اس بات کی نہیں کی کہ کوفہ کے حاکم کو کوفہ کے تخت سے ہٹا دیں۔ یا دار السلطنت پر قبضہ کر لیں۔

پھر جبکہ نہ وہ بادشاہ تھے نہ بادشاہت کے کبھی طالب ہوئے نہ بادشاہت کے لیے انھوں نے جنگ کی تو انھیں شاہ اور بادشاہ کہنے کا کیا مطلب۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ شاہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے اپنی رباعی میں یہ دو الفاظ ایک ساتھ نظم کیے ہیں:۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

تو کیا شاہ اور بادشاہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں؟ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ دو الفاظ ضرورتِ شاعری سے مصرعہ کو پورا کرنے کے لیے لائے گئے ہیں، بہت سے لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں در حقیقت ایسا نہیں ہے۔

جناب خواجہ غریب نوازؒ نے جن کا مزار اجمیر میں زیارت گاہِ جمہور ہے۔ حضرت شہیدِ کربلا امام حسینؑ کی بارگاہ میں جو

عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے وہ کوئی معمولی قدر و قیمت نہیں رکھتا
یہ اور بات ہے کہ آج جب دنیا سطحی اور مادی علوم کی
گرویدہ ہو کر حقیقت اور علم باطن سے کوسوں دور جا پڑی ہے
تو وہ ان بزرگ افراد کی گہری باتوں کی تہوں تک نہ پہنچ کر
اعتراض پر اتر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ اور بادشاہ دونوں کے الگ الگ معنی ہیں اور
ان دونوں کے ملنے سے شہید کربلا کی شخصیت اور آپ کے بلند کردار
پر جو تیز روشنی پڑتی ہے وہ کبھی ان میں سے ایک لفظ سے نہیں
پڑ سکتی تھی۔

غور کیجیے تو انسان آنکھیں کھول کر جب اپنے گرد و پیش نظر ڈالتا
ہے تو ہر طرف مادی اجسام، مادی حالات اور مادی عناصر
کی ترکیب یافتہ شکلیں اس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں وہ محبت
کرنا چاہتا ہے تو مادی اسباب کے قائم کردہ رشتے اس کی محبت
کو جذب کر لیتے ہیں۔ بچپنے میں ماں، باپ، بھائی سے روشناس
ہوا اور ان کی محبت دل میں بیٹھی۔ جوان ہوا تو جذبات کی
رو میں بہہ کر بہت سے بیگانوں سے الفت کرنے لگا۔ کبھی شخصی
اغراض اور انعام و عطا کی لالچ میں کسی کا گرویدہ ہو گیا۔ اس وقت دنیا اپنی
تمام دل فریبیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور وہ
اس کائنات کے جمال میں کھو جاتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے تو مادی نگاہ سے، سنتا ہے تو مادیت کے کانوں سے کامیابی سمجھتا ہے تو اسی دنیا کے ظاہری اقتدار کو، محبت کرتا ہے تو وقتی فائدوں اور سامنے کی دلربا صورتوں کو دیکھ کر اور نفرت کرتا ہے تو اسی دنیا کے نقصانات اور ناگوار خاطر باتوں کے احساس سے۔

خواہش پروری اور اقتدار پسندی اور پھر آخر میں دہریت، الحاد، مادہ پرستی سب اسی پہلی نگاہ میں جذب ہو جانے کے مختلف درجے ہیں۔

اس صورت میں بادشاہت اگر ہو گی تو وہ نام ہو گا کمزوروں کو غلام بنانے کا، فقیروں کو اپنا بندۂ بے دام قرار دینے کا، اور دوسروں کا خون چوس کر اپنا پیٹ بھرنے کا حیلہ مکر و فریب جس طرح سے اپنا کام نکالے گا جس کو کہا جا سکتا ہے ملوکانہ سیاست یہی وہ سلطنت تھی جس سے محمدؐ و آلِ محمدؐ ہمیشہ الگ رہے نہ وہ بادشاہ بنے نہ اس بادشاہت کے طالب ہوئے، نہ اس کے لیے کبھی جنگ کی۔

مگر دوسرا درجہ انسان کی فکر و نظر کا یہ ہے کہ وہ جمالِ صنعت کو دیکھ کر صناع کی طرف متوجہ ہو، وہ اپنے گرد و پیش کی کائنات پر غور کر کے اس بلند طاقت کی جانب مڑ جائے جو ان تمام کائنات کی پیدا کرنے والی اور ان سب کے باقی رکھنے اور تربیت کرنے کی کفیل ہے۔

جب انسان دل کی آنکھوں کو کھول کر اس طرف نظر ڈالے گا تو

مافوق امکان بجلیاں نظروں کے سامنے کوندنے لگیں گی۔ وہ جمال نظر آئیگا جسکے مثل کوئی جمال آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں۔ وہ عظمت محسوس ہوگی جس کے مثل کسی عظمت نے دل پر کبھی اثر نہیں ڈالا۔ اس درجہ تک پہنچنے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر چیز سے آنکھ بند کرلے۔ ہر شے سے رشتہ قطع کرلے۔ نہ کوئی حسن اپنی طرف اس کے دل کو مائل کرسکے نہ کوئی خوف اس کے دل کو مرعوب کرسکے۔ نہ کوئی دلکش مرقع اس کی نظر کو اپنی طرف موڑ سکے۔ بیوی بچے، بھائی بہن، عزیز اقارب کسی سے اس کی دلبستگی نہ ہو۔ وہ پہاڑوں کی اونچی اونچی سطحوں پر غاروں کی تاریک گہرائیوں کے اندر، جنگل کی وسیع فضا میں اسی ایک مرکز حسن کی یاد میں مستغرق رہے کہ جس سے زیادہ حسین جلوہ اسے کہیں نظر نہیں آسکتا۔ جو اس درجہ پر پہنچ جائے اس کو اہل سلوک کی عام اصطلاح میں "شاہ" کہتے ہیں۔ اسی میں رفتہ رفتہ انسان ترقی کرتا ہے تو محو ہو اور آخر میں فنافی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور ایک طبقہ ہے کہ جو اسی کو انسانیت کی معراج تصور کرتا ہے۔ مگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ درجہ انسانی زندگی کا آخری مقصد نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اس درجہ میں انسان کے اندر انفرادیت اور توحد یعنی تنہائی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ انسان فطری طور پر تمدنی زندگی کا حامل ہے۔ کسی شے کا نقطۂ کمال وہ نہیں ہوسکتا جو اسکی اصلی فطرت کے ساتھ متضاد حیثیت رکھے، بلکہ ایسا نقطۂ کمال وہ ہوگا کہ جس میں فطری

خاصیت حکیمانہ تربیت کے ساتھ زیادہ مفید اور منظم شکل میں نمایاں ہو۔
غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درجہ ابھی ایک درمیانی منزل ہے
جہاں رک جانا سالک کے حوصلہ کی پستی کا نتیجہ ہے۔ وہ جمال مطلق کہ
جہاں اس کی نگاہ جا کر جمی ہے اور اس کے جلوؤں میں غرق ہو گئی ہے
ایک الگ تھلگ ہستی نہیں ہے جس کا کچھ تعلق اس کائنات کے ساتھ
نہ ہو بلکہ خالق، رازق، مربی اور اصل مرکز فیض اور سرچشمۂ وجود ہونے
کی بناء پر اسے اس کائنات کے ساتھ اور کائنات کا اس کے ساتھ خاص
تعلق ہے وہ اس کی وسعت رحمت ہے۔ جو ہر ہر فرد پر چھائی ہوئی ہے
انسان اگر صحیح معنی میں کسی کے ساتھ محبت رکھتا ہے تو ہر اس شئے کے ساتھ
محبت ہونا بھی ضروری ہے جسے اس محبوب کے ساتھ تعلق ہو اور
ہر اس مفاد کو عزیز رکھنا ضروری ہے جو اس کے محبوب کو مد نظر ہو
اور اس لیے اگر انسان حقیقی معنی میں عشق الٰہی کے درجہ تک پہنچا
ہے تو وہ خلائق سے جدا ہو نہیں سکتا۔ بلکہ اگر جذبۂ عشق نے محض
وارفتہ نہیں بنا دیا ہے اور اسے محبوب کی نگاہوں کا بھی خیال ہے
اور اس کی مرضی بھی منظورِ نظر ہے تو وہ اللہ تک پہنچنے کے
بعد پھر ایک دفعہ واپس آئے گا۔ اس خلق کی طرف مگر اپنی محبت
کی آغوش کو اتنا کشادہ کر کے جو اللہ کی وسعتِ رحمت کے ساتھ سازگار رہو
سکے اور ان فرائض کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو زندگی کے کامیاب بنانے کے
لیے اس کے خالق کو مطلوب ہیں اب اسے اللہ عزّ اسمہ کے ساتھ وہ عشق بھی ہے

جو ایک شاہ یعنی عارف کامل کو ہونا چاہیئے۔ اور خلق کے ساتھ وہ تعلق بھی ہے جو ایک بادشاہ کو اپنی رعایا کے ساتھ ہمہ گیر طور پہ ہونا چاہیئے۔ پہلی منزل میں یعنی مادہ پرستی کے دور میں اگر انسان کو دنیا والوں پر اقتدار حاصل ہوا جس کا نام ہے بادشاہت تو ہر وقت اپنے اقتدار کی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اپنے اثر کو بڑھانے میں مصروف رہے گا۔ اپنے عزیزوں دوستوں اور خوشامد کرنے والوں کو ہر طرح کے فائدے پہنچانے کا مقصد پیش نظر رہے گا۔ اور کمزوروں کی آزادی کے سلب کرنے میں لذت محسوس کرے گا۔ اور یہی کوشش رہے گی۔ کہ :-

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

لیکن شاہی کی منزل تک پہنچ جانے کے بعد انسان کو عامۂ خلائق سے تعلق پیدا ہوگا۔ اس میں خلق خدا کی بہبودی ہر وقت پیش نظر رہے گی کمزوروں کو مدد پہنچانا نقطۂ نگاہ رہے گا۔ گرتے ہوؤں کو سنبھالنے ڈوبتے ہوؤں کو نکالنے اور تباہ حال افراد کو بچانے کی کوشش ہوگی یہاں اپنے اور پرائے کی تمیز نہ ہوگی۔ بلکہ اپنا سگا بھائی بھی حق سے زیادہ طلب کریگا تو اس کی بات رد کر دی جائے گی چاہے وہ اس پر خفا ہی کیوں نہ ہو جائے۔ بلکہ آئین و قوانین کے معاملہ میں بلندی تک کی مراعات پیش نظر نہ ہوگی۔ ہر وقت حق پروری اور فرض شناسی سے مطلب ہوگا۔ یہ ہوگی وہ بادشاہت۔ جو شاہ

ہونے کے ساتھ ہو اور ایسا ہی انسان حقیقی معنی میں سلطان عادل ہو سکتا ہے اچاہے تاج وتخت نہ رکھتا ہو اور حشم و خدم اس کے پاس موجود نہ ہو آپ اگر پہلی قسم کے بادشاہوں کو ڈھونڈنا چاہیں تو بہت سے نمرود فرعون اور یزید اس کی مثال پیش کرنے کے لیے آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے اور اگر ایسے شاہ ڈھونڈنا چاہیں، جو بادشاہ نہیں ہیں تو بہت سے درویش اور تارک الدنیا تاریخ کے اوراق پر اور شاید کہیں کہیں مشاہدہ میں بھی آپ کے سامنے آجائیں لیکن اگر آپ شاہ ہونے کے ساتھ بادشاہ ہونے کی مثال تلاش کیجیے تو آپ کو پیغمبر اسلامؐ اور ان کے حقیقی پیروؤں میں مل سکتی ہے اور اہل بیت رسولؐ اس کا بہترین نمونہ ہیں ان کی شاہی دیکھنا ہو تو محراب عبادت میں دیکھیے اور ان کے الفاظ میں معرفت کے دریا بہتے ہوئے دیکھ کر اندازہ کیجیے اور بادشاہی دیکھنا ہو تو مجمع اصحاب میں دیکھ لیجیے مسند قضا پر دیکھ لیجیے یا غریبوں اور محتاجوں کی صدا پر ان کے تڑپ جانے ضرورت مندوں کی آواز پر اٹھ کھڑے ہونے اور ہر ایک کی ضرورت کو فوراً پورا کرنے کی کوشش بلکہ کبھی کبھی غریبوں کے گھر پر جا کر راتوں کے پردہ میں اس کی خبر گیری اور اعانت کے مناظر کو دیکھیے۔

حسینؑ ان ہی پیغمبر اسلامؐ کے نواسے تھے جنہوں نے خالق اور مخلوق کے رشتوں کے اس باہمی ارتباط کا دنیا کو سبق دیا۔

انھوں نے جن سخت اوقات میں اور کٹھن منزلوں پر شاہی اور بادشاہی کے حدود کو نباہا ہے اس کی نظیر تاریخ انسانیت میں ناپید ہے۔
موقع نہیں کہ ان کی سیرت زندگی کے واقعات سے مکمل طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جائے مگر صرف کربلا کی سرزمین پر محرم کی دسویں تاریخ میں آپ نے جس جس طرح کا نمونہ پیش کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔
عاشور کی تاریک رات جبکہ تباہی کی ڈراؤنی پرچھائیاں ہر سمت پھرتی نظر آتی تھیں موت کا فرشتہ پر کھولے ہوئے فضا میں سایہ افگن تھا اور امید و سلامتی کے دھندلے نقوش بھی رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے تھے بلکہ بالکل مٹ چکے تھے اگر کوئی دنیا دار انسان ہوتا تو یہ رات عزیزوں سے دل بھر کر رخصت ہونے میں صرف کرتا۔ اپنے پسماندگان کو اپنے بعد کے لیے وصیتیں کرتا، اور کم از کم تدابیر جنگ میں مشورے کرتا۔ مگر حسینؑ کامل "شاہ" تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنا مصلیٰ بچھا دیا۔ ان کے ساتھ والوں کے بھی مصلے بچھ گئے اور پوری رات صرف عبادت خدا میں گزاری۔
اسی کے ساتھ حسینؑ بادشاہ تھے۔ اسی لیے انھیں یہ فکر تھی کہ اگر ساتھ والے ضمیر کی اجازت سے اپنی جانیں بچانا چاہیں تو میرے ساتھ اپنی جانیں کیوں دیں۔ اسی لیے انھوں نے عبادت خالق کی مصروفیت کے اندر اتنا وقت بھی نکالا کہ ان سب کو جمع کر کے یہ اجازت دی کہ تم لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ۔

اور اس پردۂ شب میں مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ کیونکہ دشمن کو تو میری جان سے مطلب ہے۔ تم سے سروکار نہیں، تم اپنی جان میرے سبب سے کیوں دو؟

اتنا ہی نہیں کہ انھوں نے عمومی طور پر یہ ایک تقریر فرما دی بلکہ خصوصی طور پر ایک ساتھی کے لیے جب یہ سنا کہ ان کا فرزند سرحد پر گرفتار ہو گیا ہے تو انھیں بلا کر کہا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو جاؤ۔ اور اپنے بیٹے کی رہائی کی فکر کرو۔ جب وہ کسی طرح ساتھ چھوڑنے پر تیار نہ ہوئے تو آپ نے ایک قیمتی لباس ان کے حوالے کیا کہ اسے اپنے دوسرے بیٹے کے ہاتھ بھیجو کہ وہ جا کر اسے فروخت کرے اور اپنے بھائی کو چھڑانے کا انتظام کرے۔

کیا کربلا کے ایسے ہولناک موقع پر اپنے ساتھیوں کے دکھ درد اور تکلیف کا اتنا خیال کسی معمولی انسان کو ہو سکتا ہے روز عاشور کی قربانیوں میں بھی یہ دونوں باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں حسینؑ حق کی خاطر اپنے عزیز ترین دوستوں اور بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو خوشی خوشی تلواروں کے اندر بھیج رہے تھے۔ کیونکہ وہ شاہد تھے، اللہ کی مرضی کے سامنے دنیا کا کوئی رشتہ عزیز نہ تھا۔ مگر ان کی جدائی پر روتے تھے ان کا غم بھی کرتے تھے اور ان کی لاشیں مقتل سے اٹھا اٹھا کر

لاتے تھے، اس لیے کہ وہ بادشاہ بھی تھے یعنی خلق خدا کے
ساتھ تعلق اور محبت رکھتے تھے۔

سب سے زیادہ سخت موقع وہ حسینؑ کی زندگی کا آخری
وقت ہے جب وہ زخموں سے چور تھے۔ کربلا کی گرم زمین اور
اس وقت قاتل کا قریب آنا، خنجر نیام سے نکلنا اور حسینؑ کا
سجدۂ خالق میں پیشانی رکھے ہونا، دوپہر کی دھوپ سے جلتی
ہوئی ریت اور زخمی پیشانی پر شاہی کی بلند تصویر ہے۔

قاتل سنتا ہے کہ حسینؑ کچھ کہہ رہے ہیں۔ کان قریب لے گیا
تو ضعف سے تھرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ گوش زد ہیں
کہ خداوندا میں نے اپنے امکانی فرض کو پورا کیا۔ یہ تیرا کام
ہے کہ تو میرے نانا کی امت کو عذاب سے نجات دے۔
یہ تھا بادشاہی کا تقاضا۔ جسے حسینؑ آخر وقت تک
نباہ گئے۔ بالکل سچ ہے کہ سے

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ

نہ ایسی شاہی کہیں نظر آسکتی ہے اور نہ بادشاہی نظر آسکتی
ہے۔ "واللہ کہ اسے حسینؑ کارے کردی"

ناشر:- جنرل سیکریٹری امامیہ مشن پاکستان اردو بازار لاہور ۲

(مطبوعہ:- قیامیہ پرنٹنگ لاہور)